مدارس کو یونیورسٹیوں میں ضم کیسے کیا جائے

انور غازی

''مدرسوں کو یونیورسٹیوں میں ضم کر دیا جائے تو کئی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔'' یہ الفاظ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے وائس چانسلر کے ہیں۔ ایک عرصے تک ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم ایک ہی درسگاہ میں ہوتی تھی۔ دینی علوم اور دنیاوی فنون میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ ایک اچھا انسان دنیاوی علوم وفنون بھی اللہ کی رضا، خلقِ خدا کی خدمت اور ملک وقوم کی بھلائی کے لیے ہی حاصل کرتا ہے۔ ان تعلیمی اداروں سے جنہیں اس وقت مدارس ہی کہا جاتا تھا، سے ابوریحان البیرونی اور اُن جیسے دوسرے عظیم فلاسفر، حکماء اور سائنسدان پیدا ہوئے تو وہ بھی علمِ حدیث، علمِ تفسیر، عربی زبان، فقہ اور اُصولِ فقہ کا بھی وافر علم رکھتے تھے۔ اُس زمانے کے مسلمانوں میں عظیم فلاسفر، سائنسدان اور اطباء بھی تھے۔ جغرافیہ، ریاضی، علم ہیئت اور فلکیات کے ماہرین بھی تھے جو دینی علوم بھی جانتے تھے۔ یہ سارے کے سارے مدارس سرکاری سرپرستی میں چلتے تھے اور دینی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے دور میں نظامِ تعلیم وہی چل رہا تھا۔ یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی، اُس زمانے کی سائنس اور دوسرے جدید دنیاوی علوم وفنون ہندوستان کے تمام مدارس میں رائج تھے۔ اُس وقت کے علماء ان تمام مضامین انجینئرنگ، علم الہندسہ، حساب، الجبرا، جیومیٹری، علم ہیئت اور فلکیات، جغرافیہ اور طب کو اپنے دینی مدارس میں پڑھتے اور پڑھاتے تھے۔

جب انگریز تاجروں کے روپ میں لٹیرے بن کر برصغیر آیا مختلف حیلے بہانوں سے ہندوستان کی زمینوں پر قبضے کرنے شروع کر دیے۔ برصغیر پر قابض ہو گئے تو ایسی تدبیریں شروع کر دیں جس سے مسلمان اپنے دین کو فراموش کر کے ایک غلام قوم کے طور پر اُن کے تابع ہو جائیں۔ انگریزوں کو ہندوؤں سے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ انہیں سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں سے تھا، کیونکہ یہ انگریز حکومت کو دل سے قبول کرنے والی قوم نہ تھی۔ مسلمانوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے

لیے برصغیر کے تعلیمی اداروں کو بے اثر کر دینا انگریزوں کی سیاسی ضرورت تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ہندوستان کے سرکاری دفاتر سے فارسی زبان کو ختم کر کے انگریزی زبان مسلط کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس ملک کے باشندے سرکاری دفاتر میں پہنچتے تو وہ سرکار کی نظروں میں اَن پڑھ تھے۔ چاہے وہ کتنے ہی اونچے درجے کے تعلیم یافتہ ہوں، مگر انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے سرکاری اداروں میں وہ جاہل قرار دیدیے گئے تھے۔ ادھر دوسری طرف ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے اپنے حربے استعمال کرنے شروع کر دیے۔ انگریزوں نے بھی اپنے عیسائی مبلغین بلا کر یہاں کے مسلمانوں کو طرح طرح کے لالچ دے کر اُن کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنا شروع کیا۔ ان حالات میں اس بات کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس دورِ محکومی میں اسلامی علوم وفنون، قرآن وحدیث، فقہ، اُصولِ فقہ، تفسیر اور تمام اسلامی علوم کی وہ میراث جو مدارس کے ذریعے صدیوں سے محفوظ چلی آ رہی تھی، وہ ہمارے ہاتھوں سے نہ جاتی رہے۔ اس وقت علماء نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے سوچا ہم کم از کم اسلامی علوم کو اور اسلامی اقتدار کے زمانے میں علم وحکمت کے جو دُوسرے شعبے الجبرا، جیومیٹری، علم ہیئت، فلکیات، جغرافیہ، منطق، فلسفہ، عربی شعروادب اور طب وغیرہ ان سب کو تو محفوظ کر ہی لیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔

عین اُسی زمانے میں جب دارالعلوم دیوبند قائم ہو رہا تھا، مولانا قاسم نانوتویؒ کے ایک ہم سبق سرسیّد احمد خان نے علی گڑھ میں تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا مسلمانوں کو سرکاری اداروں میں ملازمتیں نہیں مل رہی ہیں اور ہندو خوب ملازمتیں حاصل کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی معاشی وسیاسی موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہے، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی سیاست ومعیشت کے تحفظ کے لیے علی گڑھ کا ادارہ قائم کیا، تاکہ وہاں انگریزوں کے لائے ہوئے نصابِ تعلیم کو رائج کر کے کم از کم مسلمانوں کی سیاست اور معیشت تو محفوظ کر دی جائے۔ دیوبند کا مشن تھا مسلمانوں کے دِین کا تحفظ اور علی گڑھ کے اس تعلیمی ادارے کا مقصد تھا مسلمانوں کی دنیا کا تحفظ، دونوں نیتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ مسلمانوں کے دین کا تحفظ بھی ضروری ہے، ان کی سیاست ومعیشت اور دنیا کا تحفظ بھی ضروری ہے، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ پہلے یہ دونوں کام ایک ہی قسم کے تعلیمی اداروں میں ہوا کرتے تھے، اب یہ کام تقسیم ہو گئے۔ علی گڑھ کا نصاب ونظام اور طریقہ کار الگ اور دیوبند کا نصاب ونظام اور طریقۂ کار جُدا۔ دین اور دنیا میں تفریق ہوئی۔ تعلیم کے دونوں نظاموں میں خلیج پیدا ہو گئی۔ اپنے اپنے مقصد میں دونوں ادارے کامیاب ہوئے۔ دیوبند نے علومِ نبوت کی ایسی حفاظت کی کہ جب آزادی ملی اور پاکستان قائم ہوا تو وہ علومِ نبوت جوں کے توں اسی طرح محفوظ تھے جیسے انگریزوں کے آنے سے پہلے محفوظ تھے۔ پاکستان وجود میں آیا تو علماء کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ یہاں اسلامی حکومت کے شایانِ شان نظام قائم ہو، اسلامی معاشرہ قائم ہو، نظامِ حکومت بھی اسلامی ہو، نظامِ تعلیم بھی اسلامی ہو۔ پورے ملک کے نظامِ تعلیم کے طور پر نہ علی گڑھ کا نظامِ تعلیم کافی تھا نہ ہی دیوبند کا نظامِ تعلیم۔ یہ دونوں ایسے نظام نہیں تھے کہ ان میں سے کسی ایک کو

جوں کا توں پاکستان کے سب تعلیمی اداروں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاری کر دیا جائے۔

ان حضرات کا نظریہ یہ تھا کہ پاکستان میں ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جس میں دین و دنیا کی تفریق نہ ہو۔ ایک خاص مرحلے تک مشترک نصابِ تعلیم چلے۔ اس میں ضروری دینی مسائل اور قرآن وسنت کی بنیادی تعلیم بھی قومی اور مادری زبان میں ہو اور عصری علوم وفنون بھی ساتھ ساتھ چلیں۔ میٹرک تک دینی اور دنیاوی نصابِ تعلیم میں کوئی فرق نہ ہو، میٹرک کے بعد جس طریقے سے ہر علم وفن کے لیے اسپیشلائزیشن ہوتا ہے، اس نظام میں بھی ہو۔ کوئی اسٹوڈنٹ عصری علوم میں آگے بڑھے تو کوئی دینی علوم میں، پھر آگے جا کر کوئی فقہ میں تخصص کرے، کوئی حدیث میں، کوئی جغرافیہ میں، کوئی انجینئرنگ میں، کوئی طب میں، لیکن ایک لیول تک تعلیم سب کی مشترک ہو اور آگے سائنس، ٹیکنالوجی، جغرافیہ، ریاضی، انجینئرنگ اور طب وغیرہ کی تمام تعلیم بھی اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی ہو، تعلیمی اداروں کا ماحول مسلمانوں کے شایانِ شان ہو۔ پاکستان کے اس نظامِ تعلیم سے معیاری محدثین، فقہاء، مفسرین اور متکلمین تیار ہوں اور مثالی مسلمان انجینئر، ڈاکٹر، سائنسدان تیار ہوں، جو ملک وقوم کی مثالی خدمت کر سکیں اور اسلام کے مبلغ بھی بن سکیں۔ اس سلسلے میں ان حضرات نے سرکاری سطح پر برسوں کوششیں کیں کہ پورے ملک کا نظامِ تعلیم سرکاری سطح پر اس انداز میں قائم ہو، مگر آرزوئے بسیار کہ خاک شد۔

اور علماء پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ جدید تعلیم، عصری علوم وفنون اور ترقی کے دشمن ہیں، حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ اسلام کے تعلیمی تصور کے اعتبار سے عصری علوم بھی دینی تعلیم کا حصہ ہیں۔ قرآن نے کائنات کی ہر ہر چیز پر غور وفکر، تدبر اور تحقیق کر کے قوانین فطرت کو جاننے اور نظام کائنات کے سربستہ رازوں کو سمجھنے کا حکم دیا ہے۔ یہی وجہ ہے قرونِ اولیٰ سے مغلیہ دور تک مدرسے اور جامعات دینی اور عصری علوم کی آماجگاہ ہوتے تھے، جہاں فقہی وشرعی علوم کے علاوہ دوسرے تمام علوم وفنون کی تدریس، تحقیق اور تصانیف پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہونے والوں نے ایسے علمی کارنامے انجام دیے جن سے مغرب سمیت پوری دنیا نے فائدہ اُٹھایا۔ مدارس اور کالج یونیورسٹیوں کا نصاب ایک ہی ہوتا تھا۔ ایک حد تک دینی اور دنیوی تعلیم یکساں دی جاتی تھی۔ اس کے بعد ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق جو چاہتا پیشہ اختیار کر لیتا تھا۔ اس طرح اب بھی دینی مدارس اور عصری تعلیمی اداروں کے نصاب اور معیار کا فرق ختم ہو سکتا ہے۔ ایک حد تک یعنی میٹرک، ایف اے یا بی اے تک تمام مدارس اور اسکول وکالجوں کا نصاب ایک ہو۔ اس کے بعد دینی علوم وفنون اور ڈاکٹر، انجینئر، تعلقات عامہ، پولیٹیکل سائنس وغیرہ کے شعبے جدا ہوں تاکہ اس میں اسپیشلائزیشن کر سکیں۔ اس طرح جہاں ملا مسٹر کا گیپ ختم ہوگا وہیں دونوں طرف کی انتہا پسندی بھی اپنی موت آپ مر جائے گی۔ ہماری کمزوری اور پسماندگی کی ایک بنیادی وجہ تعلیم کی طبقاتی تفریق بھی ہے۔

☆.....☆.....☆